حفیظ خان کے اردو ناول " انواسی " میں مقامیت کی تشکیل اور پیشکش

Construction and presentation of locality in Hafeez Khan's Urdu novel "Anvasi"

ڈاکٹر محمد طارق انصاری [i]

Abstract:

The influence of regional culture is significant in Hafiz Ahmad's novel "Anvasi". Novel being the greatest genre of Urdu language has a greater capacity of linguistic content and cultural commentary than other genres of Urdu language. This novel describes the helplessness and despair of nativism, which is defeated by the culture of science and how the encampment of the English master is more orderly and comfortable than the old permanent population. In this novel, Urdu language is given a new flavour with Saraiki vocabulary, every day and syntactical terms. This novel is a beautiful addition to the catalogue of Urdu novels. The language of this novel is entrusting trustworthiness, credence and identity to the regional discourses and in this process of authentic image of the spirit of Pakistan in manifested.

Keywords: *Hafeez Khan, Urdu Novel, Culture , Language, Locality, Anvasi, Bahawalpur*

حفیظ احمد کے ناول "انواسی" میں علاقائی ثقافت کا اثر نمایاں ہے۔ ناول اردو زبان کی سب سے بڑی صنف ہونے کے ناطے اس میں لسانی مواد اور ثقافتی تبصرے کی صلاحیت اردو زبان کی دیگر اصناف سے زیادہ ہے۔ یہ ناول قومیت کی بے بسی اور مایوسی کو بیان کرتا ہے، جسے سائنس کی ثقافت نے شکست دی ہے اور کس طرح انگریزی آقا کا پڑاؤ پرانی مستقل آبادی سے زیادہ منظم اور آرام دہ ہے۔ اس ناول میں اردو زبان کو سرائیکی الفاظ، ہر روز اور نحوی اصطلاحات کے ساتھ ایک نیا ذائقہ دیا گیا ہے۔ یہ ناول اردو ناولوں کے کیٹلاگ میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ اس ناول کی زبان علاقائی مکالموں کی امانت، اعتبار اور شناخت کو سپرد کر رہی ہے اور اس عمل میں پاکستان کی روح کی مستند تصویر سامنے آئی ہے۔

کلیدی الفاظ: حفیظ خان ، اردو ناول ، کلچر ، زبان ، مقامیت ، فکشن ، انواسی ، بہاول پور

ناول اپنے عہد کے مسائل کو انگیز اور جذب کر سکتا ہے۔ اصناف نظم و نثر میں ناول ایسی صنف ہے جو کسی عہد کے آشوب، آگہی، ثقافت اور زبان کی نمائندگی کر سکتا ہے۔ حفیظ احمد کے ناول " انواسی " میں انھی لسانی پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جن کا تعلق اردو زبان کے عصری افسانوی بیانیے اور پاکستان کی مقامی زبان اور ثقافت سے ہے۔ جدید اردو ناول میں صرف علاقائی زبان کے الفاظ کی کثرت ہی نہیں بلکہ اردو کا نحوی نظام بھی متاثر ہوا ہے علاقائی ثقافت محض مذکور نہیں ہیں، بلکہ اپنے بنیادی لسانی ذرائع سمیت اردو ناول میں داخل ہوئی ہے۔ ناول کے لسانی تجزیے سے الفاظ اسماء روزمرہ اور ثقافت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جو ناول نگار کی طرف سے ناول کے بیانیے کا حصہ بن گئی ہے، انسان کے لاشعور میں مادری زبان کی

---

[i] صدر نشین، شعبہ اردو، پنجاب گروپ آف کالجز بہاول پور کیمپس

جڑیں مستعمل اکتسابی زبان سے زیادہ گہری ہوئی ہیں۔ قومی زبان اردو اور علاقائی زبانوں کے مقابلے میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ مختلف علاقوں کے تخلیق کار جب اردو میں کچھ لکھتے ہیں تو وہ فکری طور پر اپنی مادری زبان سے جڑے ہوتے ہیں۔ اگر ناول کا بیانیہ بھی علاقائی سیاق و سباق رکھتا ہو تو ایسی صورت میں ناول کی زبان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دراصل یہی مقالے کا مفروضہ ہے جسے ناول کے بیانیے میں برتی گئی زبان کے لسانی تجزیے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حفیظ خان نے تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانے منظر کو پیش کیا ہے۔ (اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ کا ناول "بہاؤ" زیادہ بڑا کارنامہ ہے۔)

بقول دردانہ نوشین خان:

> ”ادیب کا اپنے عہد میں لکھنا جتنا سہل ہے۔ زمان و مکان کے تبادلے سے لکھنا اتنا ہی جوکھم ہے۔“ (۱)

حفیظ خان نے اپنے ناول میں اس جوکھم کو خوب نبھایا ہے اس ناول میں مقامیت کی بے بسی اور کسمپرسی کو بیان کیا گیا ہے۔ جو سائنس کی ثقافت سے شکست کھا جاتی ہے اور یہ کہ انگریز آقا کا عارضی کیمپ، پرانی مستقل آبادی سے زیادہ منظّم اور پرآسائش ہے اس ناول میں اردو کے ذخیرہ الفاظ میں سرائیکی زبان کے الفاظ روزمرہ اور نحوی ترکیبوں سے اردو زبان کو ایک نیا ذائقہ دیا گیا ہے۔ یہ ناول اردو ناول کی فہرست میں خوبصورت اضافہ ہے۔ اس ناول کی زبان علاقائی زبانوں کو اعتبار، اعتماد اور شناخت دے رہی ہے اور اس سے پاکستانیت کا صحیح تصور اجاگر ہوتا ہے۔

اکیسویں صدی کے ناول میں مقامت ایک مزاحمت کے طور پر سامنے آئی ہے۔ مقامیت کو پیش کرنے کی سب سے خوبصورت شکل یہ ہے کہ پڑھنے والے کو مقامیت سے پیار ہو جائے اردو زبان میں مقامی علاقائی زبان خوشبو گھول دے۔ اور علاقائی ثقافتی رنگ دھنک کی طرح جھلملاتے نظر آئیں۔

> ”ناول میں پیش کردہ مقامیت کی دل آویزی کا یہ نیا پن ناول نگار نے اپنے نقطہ نظر سے تشکیل دیا ہے۔“ (۲)

نئے ناول میں مرزا اطہر بیگ نے جہاں کمپیوٹر لینگویج کو اردو بیانیے کا حصہ بنایا ہے وہاں انھوں

نے مقامیت کو بھی از سر نو دریافت کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی "خس، خاشاک زمانے" میں مقامیت کو مرعوب زدہ نہیں بلکہ دل آویز بنا دیا ہے:

"مقامیت کی دریافت نو عالمگیریت کے مقابلے میں مزاحمت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔" (۳)

اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی دور میں لکھے جانے والے ناول میں مقامیت جہاں اور جس شکل میں بیان کی گئی ہے۔ وہ مرعوب اور دبی دبی سی ہے۔ آزادی کے بعد بھی یہ رویہ برقرار رہا ہے۔ زبردستی کے فیصلے ٹھونسنے کی وجہ سے علاقائیت کو فراموش کرنے اور دبانے کی کوشش کی گئی ہے:

"زبان آہستہ آہستہ لسانی اور سماجی مسئلہ بنتی گئی اور بیشتر مقامی دانشوروں کے نزدیک اردو زبان بھی استعماری روپ دھارنے لگی۔ اردو کو قومی زبان بنانا اس زمانے کا انتظامی اور سیاسی عمل تھا مگر اس عمل نے اردو کو پاکستان میں مقامیت سے دور کرنا شروع کر دیا۔" (۴)

محمد حفیظ خان کے ناول "انواسی" میں ۱۸۷۲ء کے واقعات کو بیان گیا ہے۔ ناول کے قصے میں جب برطانوی استعمار کے ہاتھوں مقامیت برباد ہو گئی یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کی حامل جدید ثقافت نے قدیم ثقافت کو شکست دے دی۔ (سائنس ایک طرزِ حیات ہے۔ مقامیت میں جدت مثبت بات ہے)۔ جب انگریز دور میں کراچی سے لاہور تک ریلوے ٹریک بچھایا گیا تو دریائے ستلج پر آہنی پُل بناتے ہوئے مقامی آبادی کا قدیم قبرستان مسمار کر دیا گیا۔

ناول کے بیانیے کے مطابق جدید ثقافت کی فراست کے سامنے محکوم اور جمود کا شکار ثقافت کے لوگ حاکم وقت (انگریز) کو بددعا دینے کی بجائے ستلج دریا کی بربادی کی تمنا کرتے ہیں۔ مصنف نے اس ناول میں انگریز کے عارضی کیمپ کی ترتیب اور مقامی آبادی کی مستقل معاشرت کا موازنہ کیا ہے اور سرائیکی زبان کے الفاظ اور معاشرت و ثقافت کو اُردو زبان کے بیانیے میں شامل کیا ہے۔

آدم واہن ۲۰۲۰ء میں بھی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ملتان روڈ پر واقع ہونے کی وجہ سے بارونق ہو گیا ہے۔ پرانی آبادی ایک ٹیلے پر آباد ہے۔ آدم واہن ریلوے اسٹیشن کی مخالف سمت میں بھی ریت کے ٹیلے

اب کچے پکے گھروں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ جب کہ مصنف نے ۱۸۷۲ء کی جس بستی کا ذکر کیا ہے وہ تین سو نفوس پر مشتمل تھی۔ ٹیڑھی میڑھی کچی گلیوں میں بنے کچھے گھروں، چکنی مٹی کے لیپ والی دیواریں اور سرکنڈوں سے ڈھکی چھتوں کی حالت مصنف کے بیان کے مطابق کچھ اس طرح سے تھی:

> ”چھت کے لیے بھی ٹاہلی کے بالے اور بالوں کے بیچ سُچے سرکنڈے اس طرح گندھے گئے کہ طوفانی بارشوں میں بھی پانی کے قطرے تک کو اندر ٹپکنے کا راستہ نہ ملے۔“ (۵)

بحیثیت مجموعی یہ بستی اور اس کے باشندے پس ماندگی اور غربت کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ کیوں کہ ان کی گزر اوقات یعنی معاش کا سب سے بڑا ذریعہ دریائے ستلج تھا۔ کشتیوں پر مسافروں کو دریا پار کروانا اور مچھلی پکڑنا۔ اس لیے غربت اس بستی کے ہر منظر میں نمایاں ہے۔ بڑی چاہت سے بنوائے گئے ایک گھر کے بارے میں مصنف بیان کرتے ہیں، کہ:

> ”بستی میں موجود اس کے سالہا نما مکان کا قبضہ کون لے گا ابھی چند مہینے پہلے اس نے روہی سے مڑ تیے بلوا کر بڑی چاہت سے تیار کرایا تھا۔“ (۶)

اس بستی کے علاوہ پکھی واسوں کی جھونپڑیوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن ہم اس بستی یا آبادی کی ثقافت کو سرائیکی ثقافت کا ترجمان نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ بہاول پور، ملتان یا دیگر سرائیکی علاقے کے شہر تو خیر شہر تھے۔ دیہاتوں کی حالت بھی اسی بستی سے بہتر تھی۔ اصل میں ملتان کی طرف سے آتے ہوئے یہ ملتان کی آخری آبادی ہے۔ اور دریائے ستلج کے پار ریاست بہاول پور کا دارالحکومت بہاول پور واقع ہے۔ اس لیے یہ بستی ایک طرح سے لاوارث سی آبادی کی طرح ہے۔ یہاں کے باشندے توہم پرست ہیں مگر مذہب سے محبت کرنے کے باوجود اپنی عقل استعمال کرنے سے قاصر ہیں۔ بلکہ مذہبی حوالے سے ہر بات کا فیصلہ (فتویٰ) بستی کا مولوی کرتا ہے۔ جو ذاتی مفاد اور حاکم کے حکم کے مطابق رائے بدل دیتا ہے۔ یہ لوگ اپنے اجداد کی قبروں کی بے حرمتی پر بغاوت کر دیتے ہیں۔ لیکن بعد میں مولوی کے دوسرے فتوے کے مطابق قبریں کھود کر ہڈیاں وغیرہ دوسری جگہ منتقل کر دیتے ہیں۔

پیر زندہ کرامت کے عرس کی تقریبات ہر سال منعقد ہوتی ہیں۔ جس میں بستی کے علاوہ ارد گرد

کے لوگ بھی شرکت کرتے ہیں۔ اجودھن (پاک پتن) سے سبز لباس میں ملبوس درویش بھی اس عرس میں شرکت کرتے ہیں۔ یہ پیر تینوں مذاہب یعنی ہندو، مسلمان اور بدھ مذہب کے لوگوں کے لیے مقدس ہے۔ ہندو بھجن گاتے ہیں، بدھ بھکشو مناجات کرتے ہیں اور مسلمانوں کی قوالی ہوتی ہے۔ یہ مذہبی تہوار تفریح کا باعث بھی ہے۔ نذر نیاز دی جاتی ہے۔ نٹ اپنے تماشے دکھاتے ہیں۔ کسرتی جوانوں کا جوڑ پڑتا ہے، کُسنی پکڑنے کا مقابلہ ہوتا ہے۔ دریا میں موسمی پھل بہائے جاتے ہیں۔ ہر مذہب کے رہنما وعظ و نصیحت کرتے ہیں اور آخر میں اجتماعی دعا کروائی جاتی ہے۔ دریا کا پانی سوکھ جانے پر ٹونے ٹوٹکے آزمائے جاتے ہیں۔ مثلاً کڑوے کنویں کا پانی دریا میں انڈیلنا یا سات کنواری لڑکیوں کا دریا میں برہنہ ہو کر نہانا وغیرہ۔

نکاح، طلاق، عدت، خودکشی کے بارے میں بھی ان کے عقائد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس ناول میں سرائیکی ثقافت کے کئی پہلوؤں کو پیش کرنے کی گنجائش موجود تھی۔ لیکن مصنف نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ مصنف نے یہاں مقامیت کی کمزوریوں اور بے بسی کو موضوع بنایا ہے۔ پسماندہ ثقافت سہی لیکن علاقائی ثقافت کی مثبت باتوں کو پیش کیا جا سکتا تھا۔

برصغیر استعماریت کے زیر اثر رہا ہے اور یہ اثرات یہاں کی ثقافت کے تمام رنگوں میں نظر آتے ہیں۔ بعض بیرونی اقوام کی ثقافت نے مقامی ثقافت کو نکھار بھی دیا ہے اور ان اقوام نے برصغیر کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ لیکن برطانوی استعمار ہمیشہ یہاں الگ تھلگ پہچان بنائے رہا۔ یہاں کے ادب پر بیرونی اقوام کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو برطانوی حاکمیت میں ہمیں مقامیت کو کمتر، حقیر اور تذلیل کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ انگریزی عہد کے علاوہ جب دیگر اقوام کے مسلمانوں کے ماضی یا حملہ آوروں کی داستان پیش کی جاتی ہے تو اس میں بھی اصل میں علاقائیت کو دوسرا درجہ دیا جا رہا ہوتا ہے۔ اس ناول "انواسی" میں بھی حفیظ خان نے سرائیکی بستی کی بے بسی، مظلومیت کو بیان کرتے ہوئے بے ترتیبی، جہالت اور بے سروسامانی کو بیان کیا ہے۔ جب کہ انگریزوں کی معاشرت میں انھوں نے تحمل، منصوبہ بندی اور فراست کا اظہار کیا ہے۔ کہ انگریز، ہندوستان کی بودوباش، تہذیب، مذہب، ثقافت، لسانی تنوع، تاریخ اور جغرافیہ سے باخبر تھے۔ اور اس طرح وہ یہاں کے لوگوں کی نفسیات سمجھ کر ان پر غالب آئے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مقامی لٹھ بردار زیادہ دیر تک منظّم اور بندوق بردار حاکم فوج کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ انگریزوں کے عارضی کیمپ بھی زندگی

کی ساری آسائشوں سے مزین تھے۔ کچے کمروں سے ان کے خیمے بہتر تھے۔ جن میں آرام دہ کرسیاں، فولڈنگ میزیں موجود تھیں۔ دھوپ سے بچنے کے لیے چھتریاں، اوور کوٹ، لانگ چرمی بوٹ، اون کے کمبل، رابطے کے لیے ٹیلی گرام مشین، خدمت کے لیے بٹلرز، ویٹرز حاضر تھے۔ یعنی پیرافین اور کیروسین لیمپ کا مقابلہ چربی اور نباتاتی تیل سے چلنے والے مٹی کے دیے نہ کر سکتے تھے۔ سائنس اور جدید تعلیم سے کوسوں دور اس بستی کے لوگوں کے لیے ریل گاڑی جناتی، شیطانی اور حیران کر دینے والی چیز تھی۔ جس کے لیے مقامی لوگ انگریز سرکار کو بددعا دینے کی بھی جرات نہ رکھتے تھے۔ بلکہ انھوں نے بددعا بھی دی تو ستلج دریا کو۔۔۔

"برباد ہو اے ستلج! کہ جس پر لوہا ڈالنے کے لیے شہداء کا مدفن اجاڑا گیا، برباد ہو اے ستلج۔ رفتہ رفتہ تیری رگوں میں بھی موت اُترے تو بے آب ونشان ہو۔" (۷)

یعنی یہ جدید ثقافت کی جیت اور قدیم ثقافت کی شکست تھی۔ جس میں مقامیت کے منتشر کرداروں نبلو سانسی، مٹھل، ماچھی، سیا، سکندرا، کھدی، مالو، منگر، بالو دائی، ملوکاں، سکھ سوائی اور سنگری ہار گئے۔

اس ناول میں حفیظ خان نے سرائیکی الفاظ، روز مرہ اور محاورہ کو اردو زبان کے بیانیہ میں شامل کیا ہے۔ جب کہ برطانوی طرزِ حیات اور انگریزی زبان کے الفاظ بھی ناول کے بیانیے میں شامل ہوئے ہیں۔ مثلاً سروے، ڈرائنگز، ریسٹ ہاؤس، انڈس ویلی اسٹیٹ، ریلوے، سٹیم فلوٹیلا، کیروسین لیمپ، سینی ٹوریم وغیرہ۔

حفیظ خان سرائیکی زبان کے الفاظ، روزمرہ اور محاورے کو اُردو زبان میں مستعمل کرنے والے پہلے ناول نگار نہیں بلکہ اس سے پہلے شوکت صدیقی اور مستنصر حسین تارڑ بھی سرائیکی زبان کی ثقافت اور الفاظ کو اپنے ناول میں برت چکے ہیں۔ معروف نقاد اور ادیب محمد خالد اختر نے بھی اپنی تحریروں میں سرائیکی زبان کے الفاظ کو استعمال کیا ہے۔ ناول میں ملتان، بہاول پور، شجاع آباد، جلال پور، لودھراں، کوٹری، سکھر اور کراچی کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ مری اور گلیات کا ذکر بھی موجود ہے۔

ناول "انواسی" میں سرائیکی الفاظ، روز مرّہ اور محاورہ کے استعمال کے نمونے دیکھتے ہیں:۔

چوک میں بڑے بڑے ماچے بچھا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ۱۳

کہاں لے جائیں گے وہ اپنی پیڑھی کے وڈکوں کی قبریں۔	۱۳
دریا میں پانی رہا نہ مچھی۔	۱۴
گوروں سے متھامت لگایا جائے بہت ہی بھیڑے لوگ ہیں۔	۱۴
مولوی جاراللہ نے یہ کہہ کر رندا پھیر دیا آخر کو ہے ناحرامی یہ وڈکوکڑا۔	۱۴
بابے متھل کی جد کو چھوڑو۔	۱۵
مگر وہ منڈھ سے نہیں اُٹھا۔	۱۶
ونکو ونک نقوش کو ترتیب دے کر ہمیں ایک دوسرے سے الگ بناتا ہے۔	۱۶
اپنے سائیں کے قدموں میں دفن ہوئی تھی۔	۱۷
دیگر ویلے چڑھدے والی ڈھنڈ کے پاس آجانا۔	۱۷
کھنڈ کے چٹے لچھے جیسی۔	۲۶
پتتے ہاڑ کی لکھ بھی اس کی رضا کے سامنے سر نہ اُٹھائے۔	۲۶
آتے جاتے مونڈھا مار کے سینے پر چٹکی کاٹیں۔	۲۷
اس کی سینگیوں میں سے اب تک کون کون سی لڑکیاں اغوا ہو چکی ہیں	۲۷
میری دھی	۲۷
ماچھیوں کی چھوہر	۲۷
سیّدا اپنی کُنوار مکلانے پر تیار ہو جائے گا۔	۲۸
ان کے اعصاب کو مندھوڑے جا رہی تھی۔	۳۵
اس کے ملوکڑے وجود کو چھوئے گا۔	۳۶
سوہنی سوڑی منکوحہ چھوڑ کر	۳۶
اس نے آنکھیں مچیڑ کر کئی بار سر جھٹکا	۳۷
عورتیں گبھن ہوتیں۔	۵۰
سبز لمبا کرتا، اسی رنگ کی منجھلی اور سر پر پگڑی	۵۲
سانسیوں کی دوبلھن مچھی جیسی دوشیزائیں	۵۳

شام کا ویلا	۵۴
کھجور کے بھوتروں کی بنی چٹائی	۵۵
''ڈھولا لمے نہ ونج وو''۔	۵۵
نیچے دھرا بڑا سا دورا سبز رنگ کے محلول سے بھر چکا تھا۔	۵۵
نکھیرو کو اپنے چٹے میں لے لیا۔	۵۶
اس کے باپ کے سینگے نبلوسانسی نے	۵۷
پیر زندہ کرامت کا باہنا	۵۸
چلھانے کی طرف گئی۔	۵۸
کافی تو تُو بھی ہے پتر۔	۵۹
میں شودی توکب سے انتظار میں تھی۔	۵۹
فلاں کے سامنے چڑے کھولے پڑی ہے۔	۶۱
خیالات کے گڑدھال سے چھٹکارا نہیں پا سکا تھا۔	۷۶
پواندی کی طرف۔	۸۵
اچھے بھلے بُرچھے جوان۔	۱۰۹
جوانیاں مانے بغیر۔	۱۰۹
اور بھی دھواں اندھار کر دیا۔	۱۱۳
کسی راہ وٹاؤ کے نیچے لیٹ گئی۔	۱۱۵
چڑے چروا کر جھوٹ موٹ کے نخرے کیے جا رہی ہے۔	۱۱۵
باقی کے پھٹڑ ہو چکے	۱۲۳
سالہہ نما مکان کا قبضہ کون لے گا۔	۱۲۸
سیدے کے دور پار کے سوتر مساتوں تک کی نگاہیں اسی پر جمی ہوئیں تھیں۔	۱۲۹
اپنا جندرہ لگا کر	۱۲۹
ہرسانگ کے ذریعے کوٹھے پر چڑھانا۔	۱۲۹

لکڑی کا تھاپا اٹھایا۔	۱۳۱
اپنا ننگیج دکھایا۔	۱۳۱
تجھے دے گیا ایک گلر یا گلری	۱۳۱
بدنامی کا بُجا پھرتا جائے گا۔	۱۳۱
ماردوں گی کتے یدھی	۱۳۲
تمھاری عمر کی تو میری ڈوتریاں پوتریاں ہیں۔	۱۳۹
خیال کرو میرے چٹے چونڈے کا	۱۴۲
ملوکاں کی ارداسی نے منگر کو کچھ اور حواس باختہ کر دیا۔	۱۴۲
سیدلے کا نکاح ہوا تھا نکے لا	۱۴۳
صرف ناواں ڈالنے سے کوئی کسی کو بدھیل نہیں ہو جاتا۔	۱۴۳
ہم کون ہوتے ہیں ادھ میں آنے والے۔	۱۴۴
لوگ آپ کو بھی توئے توئے کریں۔	۱۴۴
آنے والی خمیس چار عزت دار آدمی بلا	۱۴۴
نہ پُتر آندی خمیس نہ۔	۱۴۵
ہاتھ کو بُجا نما اشارے میں نفی کی صورت ہلادیا۔	۱۴۵
کوئی اپنا سنگی، ملیر مسات کیوں نہیں؟	۱۵۷
جس نے شُوکے سے لوگوں کے پیشاب نکل جائیں۔	۱۵۹
لڑکیاں پوچھ ہلانے والے کتوں کے پیچھے نہیں جاتیں۔	۱۶۱
منگر کے سامنے اس کا کنڈا کوٹ کے رکھ دیا۔	۱۶۱
اومائی مویا سمجھ سیدلے کو۔	۱۶۱
عجیب انداز میں مچکنا شروع کر دیتیں	۱۷۲
مولوی صاحب کی بھاند بھی دیتا ہے	۱۷۵
قبروں کو پدھرا کرکے اوپر لائن بچھا دی ہو	۱۸۱

مائی نوانی کا تندور تھا	۱۸۲
ڈھینگر اکٹھے کیے جانے لگے۔	۱۸۲
یہ اسی کاوڑاور کرودھ کا لاوا تھا۔	۱۸۸
پگ ونڈ میں تقسیم ہوتی آئی ہے۔	۲۲۷
اس نے چٹاانکار کر دیا۔	۲۲۷
میں کوئی تھندا گراں نہیں۔	۲۳۹
میں تو ترکنڈ مچھلی کا کنڈا ہوں۔	۲۳۹
مگر ہے بالکل ہی یبل	۲۳۹
مگر سمجھ تجھے ککھ نہیں	۲۴۱
وہ گالیاں بھی دے تو کانوں میں ماکھی ٹپکے	۲۴۱
وہ قدم بھرے تو بھوئیں کو کانبا ہو	۲۴۱
اسی کی تانگ میں ہوں ہوں کرنے لگے۔	۲۴۱
ذلیل رج کے کرتے ہیں۔	۲۴۲
اس دھی چود کو میری "نہ" کو سمجھنا ہی نہیں آیا۔	۲۴۲
امانت کو اتھڑوں آنے سے گھبرائی۔	۲۴۳
اڑی سُن ! یہ نخرہ چھوڑ۔	۲۵۶
اگر ماں باپ ہی منہ پر دانگی مل لیں۔	۲۵۷
دھادنی گھوڑی کو اپنی رانوں کے نیچے سے نکلنے ہی نہ دیا۔	۲۶۰
کسی اور کے ہانگے موترے ہوئے۔	۲۶۰
منگر کے گویڑ مطابق۔	۲۶۲
گھر کی درسال کے باہر ہی روک دیا۔	۲۶۶
بھین تڑیک ادھر کھڑا کیا کر رہا ہے؟	۲۶۷
اس گاوے کے سر پر رکھ دی گئی۔	۲۷۰

ادھر ادھر نگاہیں بھنوائیں۔	۲۷۷
قل کندھانی سے زیادہ اس بات کی فکر تھی۔	۲۸۳
لتر پولے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔	۲۸۷
شادی کی مبارخی	۲۸۸
کپڑے کی تھگڑی سی ملی	۳۰۱
بستی دن کو بھی سنجی سنجی لگتی۔	۳۲۱
اتنا پورھیا تو کر ہی لیں گے۔	۳۲۴
اگر کوئی کیہل، کٹانا، کمار یا چمار۔	۳۲۹
اس سے بھی اونچی چھل آئے۔	۳۳۰
تُھک ہے تم پر اور تمھارے تارے ہونے پر	۳۳۸
جب میں ایک چولے میں ہوا کرتا تھا۔	۳۳۸
ایک ڈھانڈا نہیں مرنے دیا۔	۳۳۸
اب تو پھر بھی ہڈ بازو میں دم ہوگا۔	۳۳۸
دال روٹی کے پتیلوں کا کھڑ کا سنائی دیتا۔	۳۴۱

جہاں تک اس ناول کے عنوان ''انواسی'' کا تعلق ہے تو لفظ انواسی خالص ہندوستانی لفظ ہے۔ جس پر عربی، فارسی کا کوئی اثر نہیں ہے۔ مسعود اشعر کی اس بات نے ''بہاول پور کی ریاستی زبان میں ''انواسی'' کا کیا مطلب ہے؟'' لفظ انواسی کو متنازعہ بنا دیا کہ یہ لفظ اردو زبان کا ہے یا سرائیکی کا۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر) کے مطابق:

> ''انواسی'' وہ عورت ہے جو کنواری (باکرہ) نہ ہو۔ باکرہ کی ضد۔ ہیں یہ انواسی، ان کو ڈر کیا ہے، تو نہ جا، تیرا کورا پنڈا ہے۔'' (۸)

حفیظ خان سے پہلے یہ لفظ معروف محقق نقاد اور ناول نگار شمس الرحمٰن فاروقی اپنے ناول ''چاند تھے سرآسماں'' میں برت چکے ہیں۔

> ”نواب زینت محل نے معمولی طور پر اس کا استقبال کیا اور اپنے سامنے بٹھایا کچھ دیر سکوت رہا، پھر ملکۂ عالیہ نے ارشاد فرمایا: چھوٹی بیگم، ہمیں تمھاری بیوگی پر بہت افسوس ہے“ وہ ایک پل کو رکیں۔ وزیر شکریے کے کچھ رسمی کلمات کہنے ہی والی تھی کہ ملکۂ دوراں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا:
>
> ”لیکن تم تو ایسے سانحوں کی عادی ہو چکی ہو۔ اسے بھی سہ جاؤ گی۔ انواسی کا کلیجہ مضبوط ہوتا ہے، لوگ کہتے ہیں۔“ (۹)

سرائیکی زبان پاکستان کے چاروں صوبوں میں بولی جانے والی زبان ہے۔ اس زبان میں لوچ اور مٹھاس زیادہ ہے۔ دیگر زبانوں کے الفاظ بھی کم ملتے ہیں۔ بلکہ سرائیکی علاقوں پر عربی اور سنسکرت کے اثرات اور الفاظ قدیم ہونے کی وجہ سے سرائیکی زبان کا اس طرح حصہ بن چکے ہیں کہ اصل عربی یا سنسکرت لفظ اپنے اصل املا اور تلفظ کو کھو چکا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کئی علاقوں میں سنسکرت، لاطینی اور یونانی زبانیں دوسری زبانوں کو مالا مال کر کے خود ختم ہو گئی ہیں۔ مختصر یہ کہ ناول ”انواسی“ میں حفیظ خان نے سرائیکی الفاظ اور محاورات کو اردو بیانیے میں شامل کیا ہے اس سے اردو زبان کی وسعت میں اضافہ تو ہوا ہے۔ لیکن یہ سرائیکی زبان اور ثقافت کی اصل یا حقیقی تصویر نہیں ہے۔ حفیظ خان نے برطانوی ثقافت کی جزئیات، ماہ و سال کے حساب سے تاریخی حقائق اور اصل اعداد و شمار کو بیان کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں انھوں نے پیش کردہ سرائیکی ثقافت اور منظر کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ حالانکہ مصنف کا تعلق اسی خطے سے تھا۔ لیکن جتنا انھوں نے انگریزوں اور ان کی تعمیراتی کمپنی کا مطالعہ کیا ہے۔ اتنا سرائیکی خطے کی تاریخ سے بے خبر محسوس ہوتے ہیں۔

آدم واہن میں ۱۸۷۲ء میں بچھائے گئے ریلوے پل کے گرد و نواح میں کئی ایسی تاریخی عمارتیں موجود تھیں مثلاً:

۱۔ شاہ داؤد گردیز کا مزار (۱۷۰۰ء)

۲۔ ہندو مندر (جہاں آج کل بوائز ہائی سکول ہے۔ اوور ہیڈ برج کے بالکل قریب یہ مندر بہت عرصے تک موجود رہا ہے۔ ہندوستان میں بابری مسجد کے تنازعے کی وجہ سے مقامی لوگوں نے اسے گرا دیا)

۳۔ ہندو مندر۔ (چھمب موڑ شاہراہ سے تقریباً ڈھائی کلو میٹر کے فاصلے پر دو گنبدوں والا یہ مندر آج بھی موجود ہے)۔

مصنف اگر اس طرح کے تاریخی مقامات کا تذکرہ اپنے ناول میں کر دیتے تو تاریخی اور ثقافتی تناظر زیادہ واضح اور مستند ہو جاتا ہے۔

حفیظ خان کے ناول "انواسی" کی زبان کے حوالے سے بہت سی باتیں بحث طلب ہیں۔ جس علاقے یا بستی کا قصہ بیان کیا گیا ہے وہ بستی لودھراں اور بہاول پور کے درمیان دریا کے کنارے واقع ہے۔ اس بستی کے باشندوں کی زبان پر دونوں بڑی آبادیوں (بہاول پور، لودھراں) کے واضح اثرات ہونے چاہیے تھے۔ لیکن مصنف نے سرائیکی زبان کی مٹھاس اور نرماہٹ کی بجائے کرخت الفاظ و محاورات کا چناؤ کیا ہے۔ زبان کے اس انداز کو Slang Language کے قریب قریب کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً ان الفاظ و مرکبات اور جملوں کو دیکھیں:

> "تڑی، عورتیں گبھن ہوتی ہیں، الٹا کئی حرامیوں کی بنڈ کٹائی جھونکے میں ہو گئی،
> فلاں کے سامنے چڈے کھولے پڑی ہے۔ اڑ بنگی، گڑ دھال، گرگاٹ، جب وہ ویلا آیا تو
> کیا بھاؤ گی میرا ٹٹو!، تجھے گبھن کروں گا، بہت کتی چیز ہے تو، برچھے جوان، تجھے
> دے گیا ایک گلر یا گلری۔ ماردوں گی کتے یدھی، دھی چود، منہ پر دانگی مل لیں۔
> بہن سٹیک اڑیاں کیسے کرتی ہے، ہانگے موترے، بھین تڑیک، ٹھک ہے تم پر،
> انھیں تو ٹٹی آئے گی نا۔ وڈ کوکڑا"

یہ ساری مثالیں سرائیکی زبان کے اصل دھیمے پن، سلیقے اور تہذیب کے خلاف ہیں۔ حالانکہ ستلج دریا سے سرائیکی زبان کے ریاستی لہجے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جوں جوں مغرب کی طرف سفر کرتے جائیں (یعنی سندھ کی طرف) تو سرائیکی زبان کی نرماہٹ بڑھتی جاتی ہے۔ یہ اصل میں سندھ کے صوفی ازم کے اثرات بھی ہیں۔ جب کہ مشرق کی طرف رُخ کریں تو سرائیکی زبان میں سے لوچ اور نرماہٹ کم یا ختم ہوتی جاتی ہے۔ ملتانی لہجے پر بھی جانگلی زبان کے اثرات ہیں۔ یہ بات بھی درست ہے کہ بعض اوقات کسی خاص طبقے یا کردار کی وجہ سے اس طرح کی زبان لکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ناول میں کوئی بھی ایسا

کردار نہیں ہے جس نے سرائیکی زبان کے دھیمے پن اور نرماہٹ کو پیش کیا ہو۔ جب کہ گنجائش موجود تھی۔

سرائیکی زبان پاکستان کے چاروں صوبوں میں بولی جاتی ہے۔ پنجاب کے ایک بڑے علاقے کی یہ مقبول و معروف زبان ہے۔ ماضی میں پنجاب کی سیاسی تقسیم سے اس زبان کی تاریخ دانستہ مسخ کی گئی ہے۔ سرائیکی پٹی پشاور سے شروع ہوتی ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان، میانوالی، ڈیرہ غازی خان، ملتان، بہاول پور، رحیم یار خان سرائیکی پٹی میں شامل ہیں۔ سندھ سے راجھستان، احمد آباد اور گجرات تک اس کے اثرات موجود ہیں۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ آدھا پنجاب، آدھا سندھ، ایک تہائی خیبر پختونخواہ سرائیکی بولتا ہے۔ بلوچستان کے کچھ علاقوں میں بھی سرائیکی بولی جاتی ہے۔ سرائیکی زبان کا خالص یا معیاری لہجہ بہاول پور، احمد پور، اوچ شریف میں بولا جاتا ہے۔

جغرافیائی طور پر بھی "اوچ" سرائیکی خطے کا نیوکلیس ہے۔ نہ تو اس علاقے پر پنجابی کے اثرات ہیں اور نہ ہی سندھی اور ہندکو کے۔ دریائی علاقے میں خالص زبان ملتی ہے۔ احمد پور، اللہ آباد اور بہاول پور کے پرانے محلے (جن پر آبادکاروں کی زبان کے اثرات نہیں ہیں) سرائیکی زبان کی تہذیب اور ثقافت کو پیش کرتے ہیں۔ ملتان کو سرائیکی زبان کی دِلی اور بہاول پور کو سرائیکی زبان کا لکھنؤ کہا جاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ دردانہ نوشین خان، "ناول اور جغرافیہ ثقافت کے رنگ"، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، خصوصی نمبر: اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ (جلد: اول)، اکادمی ادبیات پاکستان، پطرس بخاری روڈ سیکٹر ایچ ایٹ/ون اسلام آباد، شمارہ ۲۲-۱۲۱، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء، ص ۱۱۲۔

۲۔ ڈاکٹر شاہد نواز، "اکیسویں صدی کے اردو ناول میں مقامیت کے دلآویز تشکیل"، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، خصوصی شمارہ اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ (حصہ: دوم)، شمارہ ۲۴-۱۲۳، جنوری تا جون ۲۰۲۰ء، ص ۱۱۲۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۰۹۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۰۸۔

۵۔ محمد حفیظ خان، انواسی (جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۹ء)، ص ۱۲۹۔

۶۔ ایضاً، ص۱۲۸۔

۷۔ ایضاً، ص۲۲۹۔

۸۔ اُردو لغت تاریخی اصول پر، ص۹۹۷۔

۹۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، (کراچی: شہرزاد،۲۰۰۶ء)، ص۸۰۶۔